بسم اللہ الرحمن الرحیم

آرٹ اور اسلام

گلاب کے پھول کے متعلق کسی طبیب سے پوچھئے وہ بتائے گا کہ اس کا مزاج حار و یابس ہے اور تاثیر کے اعتبار سے ملین اور مدر۔ خواص کی طرف آیئے تو یہ مقوی اور مفرح قلب ہے اور جگر کی اصلاح میں بھی مدد دیتا ہے۔ اس کے عرق اور گل قند کا شمار منفعت بخش ادویات میں ہوتا ہے۔ فطرت نے اس میں بڑے فوائد رکھے ہیں۔

جمالیاتی پہلو

لیکن یہی پھول جب ایک ایسے صاحبِ ذوق کی نگہ حسن شناس کے سامنے آئے جسے فطرت نے حسِ لطیف سے نوازا ہو' تو اسے اس کے اندر' دل کش رعنائیوں اور کیف آور زیبائیوں کی ایک دنیا' مسکراتی مچلتی' کھیلتی' ناچتی دکھائی دے گی۔ اس کی نرم و نازک پتیوں کی لطافت' اس کی شفق آمیز رنگینیوں کی نظافت اس کی نکہتِ جاں نواز کی عطر بیزیاں۔ اس کی شگفتگی و شادابی کی مسرت خیزیاں' ہر چشمِ جمال آشنا کو دعوتِ نظارہ دیں گی۔

اور پھر کشش و جذب کا یہ عالم' پھولوں تک ہی محدود نہیں۔ اس نگاہ سے دیکھئے تو صحنِ چمنِ کائنات کا ایک ایک گوشہ' دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا آئینہ دار نظر آئے گا۔ یہاں کوئی شے ایسی نہیں دکھائی دے گی جس میں افادی پہلو (Utilitarian Aspect) کے ساتھ جمالیاتی پہلو (Aesthetic Phase) موجود نہ ہو۔ سورج کی نور پاشیوں میں' چاند کی ضیا باریوں میں' ستاروں کی مرصع کاری میں' کہکشاں کی روشن نگاری میں' بادلوں کی سبک خرامی میں' نسیم سحر کی خوش

پیامی میں، سمندر کی تلاطم خیزیوں میں، ندی کی سکوت آمیزیوں میں، سروقامت درختوں کی پرشکوہ صف آرائی میں، اور ان کی طرف لپک کر آنے والے پرندوں کی نغمہ سرائی میں، غرض یہ کہ نگارخانۂ کائنات کی کسی شے کو لیجئے، اس میں منفعت بخشی کے ساتھ ساتھ جمال آفرینی، یوں سموئی ہوئی نظر آئے گی جیسے کسی خوبصورت، محوخواب بچے کے خاموش لبوں کی بہار آفریں مسکراہٹ۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

صدرنگ ربوبیت

حقیقت یہ ہے کہ خدا نے جب انسان کی پرورد گاری (نشوونما۔ ربوبیت) کا ذمہ لیا، تو ضروری تھا کہ اس کی زندگی کے ہر گوشے کے لئے سامانِ نشوونما مہیا کیا جاتا۔ انسان کی ضروریات، طبعی ہی نہیں، جذباتی بھی ہیں اور اس کے جذباتی تقاضوں کی تسکین کے لئے ضروری تھا کہ اس کے لئے مہیا کردہ سامانِ نشوونما میں افادی اور جمالیاتی دونوں عنصر موجود ہوتے۔ حیوان اور انسان میں ایک خطِ امتیاز یہ بھی ہے کہ حیوان کے تقاضے صرف طبعی ہوتے ہیں لیکن انسان کو ذوقِ جمالیات بھی ودیعت کیا گیا ہے۔ ایک گائے کے نزدیک پھول اور گھاس یکساں چارہ اور شکم پری کا سامان ہیں لیکن انسان ان دونوں میں تمیز کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ حیوانی سطح سے ابھر کر، انسانی سطح پر آ چکا ہو۔

حدود وقیود

لیکن جس طرح انسان کی طبعی زندگی کے تقاضوں کی تسکین کے لئے چند قواعد وضوابط کی ضرورت ہے اسی طرح اس کی جذباتی زندگی کے تقاضوں کے پورا کرنے کے لئے بھی حدود وقیود لاینفک ہیں۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین، وہ حدود وقیود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے انسان کی طبعی اور جذباتی زندگی کے تقاضے پورے کرنے سے، انسان کے جسم اور اس کی ذات، دونوں کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور اس طرح انسان اس دنیا میں بھی جنت بداماں زندگی بسر کرتا ہے، اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی، مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی، ذرا آگے آئے گی۔

دین، خدا کی طرف سے، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے انسانوں کو ملتا رہا۔ لیکن انسانوں نے اس میں اپنے خیالات ونظریات کی آمیزش کر کے، اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ دین کی اس مسخ شدہ صورت کو مذہب کہتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ مذہب کی دنیا میں پہنچ کر، انسانی زندگی کے ان دونوں تقاضوں کے ساتھ کیا ہوا؟

مذہب کا تصور

مذہب کا بنیادی تصور یہ ہے کہ یہ دنیا قابل نفرت ہے۔ یہاں کی ہر شے شر ہے۔ اس لئے خدا پرست انسان کو چاہئے کہ وہ دنیا سے دور بھاگے۔ یہاں کی ہر شے سے نفرت کرے۔ وہ جس قدر مادی دنیا کے لذائذ وحظوظ سے قطع تعلق کرتا جائے گا اتنا ہی خدا کا مقرب بنتا جائے گا۔ حتیٰ کہ اگر اس کی کیفیت یہ ہو جائے کہ ان جاذبیتوں کے لئے اس کے دل میں خواہش تک بھی پیدا نہ ہو، تو اس کی مکمل نجات ہو جائے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک انسان زندہ رہے گا اسے کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت لامحالہ رہے گی۔ اس سے اسے مفر ہی نہیں۔ وہ انہیں کم کر سکتا ہے۔ لیکن ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ جنگل میں چلا جائے۔ غاروں میں جا بسے۔ پہاڑ کی چوٹی پر آسن جما کر بیٹھ جائے۔ اسے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کے لئے ضرور چاہئے۔ اس لئے مذہب پرست لوگ، کھانے پینے کی چیزوں کو تو مطلق حرام قرار نہ دے سکے۔ البتہ جن عناصر کا تعلق انسان کے جذبات سے تھا۔ یعنی اشیائے کائنات کا جمالیاتی پہلو، انہوں نے ان کا گلا ضرور گھونٹ دیا۔ پھر، اتنا ہی نہیں کہ یہ لوگ ان چیزوں سے مجتنب رہے ہوں

ان کے مقربین کی زندگی

انہوں نے ایسی زندگی بسر کرنا۔ تقاضائے ''روحانیت'' قرار دیا جو ہر صاحب ذوق کے نزدیک انتہائی قابلِ نفرت ہو۔ آپ ان کی روحانی دنیا کے بڑے بڑے اکابر کے حالات

پڑھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ نہایت گھناؤنے اور نفرت آگیں ماحول میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ عیسائیوں کے (Saints) ہوں یا ہندوؤں کے سنیاسی۔ وہ بدھوں کے بھکشو ہوں یا ارباب خانقاہیت' ان سب کی کیفیت ایسی ہی نظر آئے گی۔ کسی کے متعلق کہا جائے گا کہ اس نے ساری عمر غسل ہی نہیں کیا۔ فلاں نے عمر بھر نہ حجامت بنوائی نہ ناخن ترشوائے۔ کسی نے غلاظت کے ڈھیر اور دلدل میں زندگی گزار دی۔ کوئی ساری عمر کھلے آسمان کے نیچے بیٹھا رہا۔ کوئی کنویں میں لٹکا رہا۔ آپ اب بھی اپنے ہاں کے کسی ''اللہ والے سائیں بابا'' یا ان سے بھی اگلی منزل میں پہنچے ہوئے مجذوب کو دیکھئے۔ غلاظت و کثافت کی وجہ سے آپ کا ذوقِ سلیم ان کے قریب تک جانے سے اِبا کرے گا' لیکن عقیدت مندوں کے ہجوم کو اسی مزبلہ میں جنت کی ہواؤں کی خوشبو آ رہی ہوگی جو لوگ اس تفریط تک نہیں جاتے' ان کی شریعت بھی زیبائش و آرائش کی چیزوں کو حرام قرار دینے میں کسی سے پیچھے نہیں رہتی۔

چور دروازے

اگرچہ مذہب کی دنیا بیشتر انہی لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کی نہ ذہنی سطح بلند ہوتی ہے اور نہ ہی جو ذوقِ لطیف سے بہرہ یاب ہوتے ہیں' لیکن ان گھرانوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن میں یہ ذوق موجود ہوتا ہے۔ وہ اس کی تسکین کے لئے چور دروازے تراش لیتے ہیں مثلاً عیسائیوں کی شریعت اور طریقت' دونوں میں مادی دنیا قابلِ نفرت ہے لیکن آپ روم کے بڑے بڑے عظیم الشان گرجوں کو دیکھئے۔ ان میں آپ کو مصوری اور مجسمہ تراشی کے نادر نمونے ملیں گے۔ جنتِ نگاہ کے لئے ان کی خانقاہوں میں حسین وجمیل راہبات (Nuns) تنگ وتاریک کوٹھڑیوں میں جگمگاہٹ پیدا کر رہی ہوں گی اور گرجے کی انتہائی نرم ونازک موسیقی ان کے لئے فردوسِ گوش بنے گی۔ یہی کیفیت ہندوؤں کے مندروں اور سنیاس آشرموں میں نظر آئے گی۔ مجسمے' تصویریں' کرشن' رادھا' اور گوپیوں کے عشق ومحبت کی ہیجان خیز داستانیں اور انہی پر مشتمل ان

کا سنگیت، رنگ و رامش کے یہ ہنگامے ان کے ہاں بھگوان کی پوجا اور آتما شکتی کے ذرائع ہیں۔ خود ہمارے ہاں تصوف کے بیشتر خانوادوں میں بلند پایہ موسیقی (جس کا جھٹکا قوالی کی شکل میں کیا جاتا ہے) روحانی منازل طے کرنے کی سیڑھیاں قرار دی جاتی ہیں جو اتنی دور تک نہیں جاتے، وہ مزامیر (سازوں) کے بغیر موسیقی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ (گویا ایک ہی آواز جو انسان کے گلے سے نکلے وہ حلال لیکن وہ لوہے کے تار یا بنسری کے چھید سے نکلے تو حرام!) اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس قسم کی تفریق کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی طرف جس میں حسنِ کائنات کی تمام جلوہ افروزیاں سمٹ کر آ گئی ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارا زاہدِ خشک، قرآن کریم کی جس قرات پر وجد میں آ جاتا ہے، اس میں بھی موسیقی کی لے نئے ناشنیدہ کی طرح ارتعاش انگیز ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں حجازی اور مصری، دو قرأتیں زیادہ مقبول اور مروج ہیں۔ ان میں سے ایک بھیروں راگ میں ہوتی ہے۔ اور دوسری بھیرویں میں۔ یہ سب اس لئے کہ بجز ان لوگوں کے جو اس ذوق سے یکسر محروم ہوں، یعنی جو انسانی سطح تک پہنچ نہ پائے ہوں ذوقِ لطیف سینے میں انگڑائی ضرور لے گا۔ اگر آپ اس کی تسکین کا سامان کھلے بندوں نہیں کریں گے، تو وہ اپنے لئے زمین دوز سرنگیں کھود لے گا۔

پری رو تاب مستوری ندارند
چوں در بندی زروزن سر برآرند

یہ زمیں دوز سرنگیں۔۔۔ یعنی زروزن سر بر آوردن۔۔۔ آج کل کی نفسیاتی اصطلاح میں۔۔۔ بدنہادی، یعنی (Perversion) کہلاتی ہے۔ جس کا نتیجہ انسانی ذات کی نشوونما کی بجائے اس کی تحلیق (گلا گھونٹ دینا) اور تدفین ہوتا ہے۔ مذہب کی دنیا میں ہوتا ہی یہ ہے۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقائق کا مقابلہ کرنا نہیں سکھاتا۔ وہ کنکھیوں سے دیکھنا سکھاتا ہے۔ وہ بظاہر، صبح سے شام تک، جذبات کی مخالفت میں سرگرمِ سخن رہتا ہے لیکن درحقیقت، یہ بہانہ ہوتا ہے انہی جذبات کو اپنے سینے میں متلاطم رکھنے اور ان سے ذہنی لذت حاصل کرنے کا۔ اس کی روش عجیب مضحکہ انگیز ہوتی ہے۔ وہ خدا کو عدیم النظیر صانعِ کائنات مانتا اور اس کی عظمت کے سامنے اپنا

سرِ نیاز خم کرتا ہے' لیکن اسی صانع کی عظیم صنعت گری' یعنی دنیا اور اس کی زیبائش و آرائش کی چیزوں کو قابل نفرت اور انسان کے جذبات وعواطف کو فنا کر دینے کے لائق قرار دیتا ہے اور اسے اپنی انتہائی خدا پرستی پر محمول کرتا ہے صانع کی تعریف اور اس کی صنعت کی مذمت' یہ مذہب کی بارگاہ ہی میں ممکن ہے۔ اس کے برعکس' دین نہ دنیا کو قابل نفرت قرار دیتا ہے' نہ انسانی جذبات کو فنا کر دینے کے قابل۔ وہ انسان کی کسی صلاحیت کو نہ بجائے خویش خیر قرار دیتا ہے نہ شر' ان کا استعمال انہیں خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس اجمال کی تفصیل کیا بیان کرتا ہے۔

قرآنی تصور

ہمارے ہاں دو اصطلاحیں مروج ہیں۔ جلال اور جمال۔ جلال میں قوت بھی شامل ہے اور ہر شے کا افادی پہلو بھی' کیونکہ افادی پہلو کا صحیح استعمال' قوت پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اس کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔

اس کے برعکس' جمال' کسی شے کا تحسینی پہلو ہے۔ یعنی اس کی (Appreciative Value) اس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' مذہب کی دنیا' اشیائے کائنات کے جلالی (یا افادی) پہلو کو تو خدا کی طرف سے خیر قرار دیتی ہے' لیکن ان کے جمالیاتی پہلو کو جس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے' شر سمجھتی ہے۔ یہ ثنویت (Dualism) درحقیقت' مجوسیوں کے ذہن کی پیدا کردہ ہے جن کے ہاں نیکی کا خدا اور ہے (یعنی یزداں) اور برائی کا خدا اور (یعنی اہرمن)۔ قرآن کریم نے آکر اعلان کیا کہ ثنویت کا یہ تصور یکسر باطل ہے۔ جلال اور جمال' دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ یعنی خدائے واحد کی ذات۔ **لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ** (64:1) قوت (اقتدار) اور حمد دونوں کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے۔ کسی صانع کے نادر شاہکار کو دیکھنے سے' جذباتِ تحسین و آفرین کا ابھر کر' بے ساختہ زبان پر آجانا' حمد کہلاتا ہے۔ قرآن کریم میں' خدا کو بار بار حمید کہا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی حسن آفرینی محض اتفاقی یا ہنگامی

نہیں۔ اس کا مظاہرہ التزاماً اور دواماً ہوتا رہتا ہے۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
رہتا ہے آئینہ ابھی دائم نقاب میں

آپ نے غور کیا ہوگا کہ قرآن مجید کی ابتداء **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** سے ہوتی ہے۔ (1:1) ربوبیت (پرورش اور نشو و نما) سے اگر اشیائے کائنات کا افادی پہلو سامنے آتا ہے تو حمدیت سے ان کا جمالیاتی گوشہ بے نقاب ہوتا ہے۔ اسی لئے اس نے، خدا کی طرف جانے والے راستے **صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ** کہا ہے (14:1) یعنی وہ راستہ جس پر چلنے سے، غلبہ اور قوت بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی زندگی کے نرم و نازک گوشے بھی سنورتے اور نکھرتے چلے جاتے ہیں۔

خدا نے اپنے عمل تخلیق کے متعلق کہا ہے:

اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (32:7)

خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو حسین تریں انداز میں پیدا کیا ہے۔

خدا کا عملِ تخلیق

حسن نام ہے صحیح توازن اور تناسب کا۔ جہاں کسی شے کے توازن و تناسب (Proportion) میں ذرا سا فرق آیا، اس کا حسن جاتا رہا۔ پسکال نے ٹھیک کہا تھا کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ذرا چپٹی ہوتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ خدا نے اپنے عملِ تخلیق کے متعلق بڑی تحدی کے ساتھ کہا ہے کہ تم اس میں کہیں عدم توازن نہیں دیکھو گے۔ کسی شے کو غیر متناسب نہیں پاؤ گے۔ اس کے کہنے کا انداز ملاحظہ کیجئے۔ سورۃ الملک میں ہے **مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ** تم خدائے رحمٰن کی تخلیق (اشیائے کائنات) میں کہیں کوئی جھول، کوئی سلوٹ، کوئی شکن نہیں دیکھو گے۔ کہیں عدم تناسب نہیں پاؤ گے۔ **فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ** طائرِ نگاہ کے

پرَ کھول کر اسے کائنات کی فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی دو اور پھر اس سے پوچھو کہ کیا اس میں کہیں کوئی سقم، کوئی عیب، کوئی شگاف کوئی بدنمائی دکھائی دی ہے؟ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَيۡنِ ایک بار نہیں۔ بار بار نگاہ سے کہو کہ وہ اچھی طرح سے دیکھے۔ خوب تلاش اور تجسّس کرے۔ يَنۡقَلِبۡ اِلَيۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيۡرٌ (67:4) وہ خاسر اور واماندہ، ناکام اور مایوس کاشانۂ چشم میں لوٹ آئے گی۔ نگار خانۂ فطرت میں اسے کہیں کوئی سقم دکھائی نہیں دے گا۔

زیبائشِ ارضی

اب آگے بڑھئے۔ زمین سے انسان کے لئے سامانِ زیست پیدا ہوتا ہے، اس لئے اس کی حیثیت یکسر افادی نظر آتی ہے۔ لیکن خدا کا ارشاد ہے کہ اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَى الۡاَرۡضِ زِيۡنَةً لَّهَا (18:7) زمین پر جو کچھ بھی ہے اس میں ہم نے زینت و آرائش کا پہلو بھی رکھا ہے۔ دیکھو تو، یہ اس قدر رنگا رنگ کے حسین گہنے پہنے، کس قدر دلہن بنی نظر آتی ہے؟ ہم نے کارگہِ فطرت کو ایسا حسین و خوش رنگ کیوں بنایا ہے؟ لِنَبۡلُوَهُمۡ اَيُّهُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا (18:7) تاکہ انسان بھی اپنی ذات میں اعتدال اور توازن پیدا کر کے، اپنے اعمال کو اسی طرح حسین و جمیل بنائے۔ قرطاسِ ارض پر حسن کی گلکاریاں اس امر کی محرک بنتی ہیں کہ انسان خود اپنی ذات، اور اپنے معاشرہ میں حسن پیدا کرے۔ یعنی اس کا توازن نہ بگڑنے دے۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ قرآن نے ''نیک عملی'' کو حسنات (حسن عمل) کہہ کر پکارا ہے! یعنی وہی عمل، مقبولِ بارگاہِ خداوندی ہے جس میں حسن ہے۔

فضا کی آرائش

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ قرآن کریم نے سطح ارض پر بچھی ہوئی بساط کی زینت و آرائش کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اب نگاہ آسمان کی طرف اٹھایئے اور دیکھئے کہ اس مرصع چھت میں آپ کو کس قسم کی مینا کاری نظر آتی ہے؟ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے کہ چاند، سورج، ستارے، بڑے بڑے عظیم کرے ہیں جو فضا کی پہنائیوں میں مصروفِ گردش ہیں۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی

کہتا ہے کہ وَلَقَدۡ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ (67:5) تم دیکھو کہ جو فضا سطح ارض سے قریب تر ہے اس میں تمہیں کس قدر حسین وجمیل شمعیں فروزاں نظر آتی ہیں۔ چونکہ ہم جانتے تھے کہ تمہیں ہر شب' سونے سے پہلے' آسمان کی طرف دیکھنا ہے' اس لئے ہم نہیں چاہتے تھے کہ تمہاری نگاہ اوپر کو اٹھے تو وہاں بڑے بڑے بھیانک کرے دکھائی دیں جس سے تمہاری نیند اچاٹ ہو جائے اور تمہارے بچے ڈر کے مارے سہم جائیں۔ ہم نے ایسا انتظام کر دیا کہ یہ بھیانک کرے تمہیں جگمگاتی قندیلیں نظر آئیں جو تمہارے لئے وجہ نورانیٔ دل و دیدہ ہوں:۔ وَلَقَدۡ جَعَلۡنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّ زَیَّنّٰہَا لِلنّٰظِرِیۡنَ (15:16) فضائے آسمانی کے ان عظیم الجثہ کروں کو ہم نے دیدء وبینا کے لئے کیسا خوش نما بنا دیا؟

مویشیوں کی دنیا

سورہ نحل میں' افادی اور جمالیاتی پہلو' بڑے حسین انداز میں سامنے لائے گئے ہیں۔ پہلے کہا۔ وَالۡاَنۡعَامَ خَلَقَہَا ۚ لَکُمۡ فِیۡہَا دِفۡءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ (16:5) تم مویشیوں کو دیکھو۔ ان میں تمہارے لئے کس قدر فائدے کی چیزیں ہیں۔ ان کی اون سے تم گرم کپڑے بناتے ہو۔ ان کا گوشت تمہارے کھانے کے کام آتا ہے۔ وَتَحۡمِلُ اَثۡقَالَکُمۡ اِلٰی بَلَدٍ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا بٰلِغِیۡہِ اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ ؕ (16:7)۔ ان میں جو بار برداری کے کام آتے ہیں وہ تمہارا سامان اٹھا کر دور دراز شہروں میں لے جاتے ہیں۔ اگر تمہیں یہ سامان خود اٹھانا پڑتا تو تم کس مصیبت میں پڑ جاتے؟ وَّالۡخَیۡلَ وَالۡبِغَالَ وَالۡحَمِیۡرَ لِتَرۡکَبُوۡہَا۔ پھر تم گھوڑوں' خچروں اور گدھوں کو دیکھو۔ وہ تمہاری سواری کے کام آتے ہیں۔ وَزِیۡنَۃً (16:8) اور بعض ان میں سے تمہارے لئے سامانِ زینت بھی بنتے ہیں۔

یہاں تک آپ نے دیکھا کہ مویشیوں کے افادی پہلو کو ابھار کر سامنے لایا گیا ہے اور جو کچھ کہا گیا ہے اس باب میں اس سے زیادہ اور کہا بھی کیا جا سکتا ہے لیکن نہیں! ٹھہریئے اور دیکھئے کہ قرآنِ کریم ان کے متعلق اور کیا کہتا ہے؟

محاکات

مناظر کشی، شاعری کی جان ہوتی ہے اور مصوری کی روح۔۔۔۔ ذرا چشمِ تصور سے دیکھئے کہ یہ الفاظ آپ کے سامنے کس قدر حسین و پر کیف منظر پیش کرتے ہیں کہ۔۔۔۔

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام

یا۔۔۔ گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل۔ اس کے ساتھ ہی۔۔

آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں!

یا ایک طرف۔۔۔ وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح۔۔۔ اور دوسری طرف،

وادئ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

ان میں سے ایک ایک منظر، حسن کی چلتی پھرتی دنیا اپنے جلو میں لئے ہے۔

اب ذرا انہی آیات کی طرف پھر چلئے جن کا تذکرہ اوپر سے چلا آ رہا تھا۔ یعنی یہ کہ تمہارے لئے تمہارے مویشیوں میں کس قدر منفعت بخش چیزیں ہیں۔ یہ سب کچھ گنانے کے بعد کہا کہ ان میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے لیکن اس ''کچھ اور'' کے دیکھنے کے لئے نگہِ نظارہ جُو کی ضرورت ہے، کہ **وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ** (16:6) ذرا چشمِ تصور سے دیکھو کہ علی الصبح، تاروں کی چھاؤں میں، نور کے تڑکے، جب فضا کی آنکھیں ہنوز نیم خوابیدہ نیم وا ہوتی ہیں، اور چاروں طرف سکوت کا عالم، اس وقت جب تم ان مویشیوں کو چوپال سے نکال کر، باہر چراگاہوں کی طرف لے جاتے ہو، تو یہ منظر کس قدر جمال آفریں ہوتا ہے۔

اور پھر شام کے وقت، جب سورج تھک کر، پہاڑ کی اوٹ میں ستانے چلا جاتا ہے۔ فضا پر چاروں طرف دھندلکا چھا جاتا ہے۔ کھیت اداس اور راستے خاموش ہو جاتے ہیں تو اس وقت جب تم ان مویشیوں کے گلے کو چراگاہوں سے خراماں خراماں بستی کی طرف واپس لاتے ہو، تو یہ سماں

بھی کس قدر کیف بار ہوتا ہے۔ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (16:6)۔ تمہاری نگاہیں ان کے افادی دائروں میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں لیکن اگر تمہارے سینے میں برف کی قاش نہیں، دھڑکنے والا دل ہے، تو تم محسوس کرو گے کہ ان کے اس جمالیاتی پہلو کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ یہ بے بہا ہیں۔

آپ نے مویشیوں کے اس طرح چراگاہوں کی طرف جانے اور واپس آنے کے مناظر، کسی عظیم ترین مصور کے نادر شاہکار میں دیکھے ہوں گے اور یا پھر قرآن کریم کے ان چند الفاظ میں۔ ذرا چشم تصور سے کام لیجئے اور دیکھئے کہ کیا ان الفاظ کے محاکاتی اعجاز کے سامنے ہر نگہِ جمال آشنا جھک جھک نہیں جاتی؟

اطاعت سے زینت

اب آگے بڑھئے۔ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مذاہب کی دنیا میں تصور یہ ہے کہ جس قدر کوئی شخص خدا کی بندگی۔ پوجا، تپسیا، بھگتی، گیان دھیان میں آگے بڑھتا ہے اتنا ہی وہ دنیا اور اس کی زیبائش وآرائش سے دور ہٹتا چلا جاتا ہے۔ گویا خدا کا تقرب اور دنیاوی زیبائش وآرائش، ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ زاہد کے لئے خشک ہونا ضروری ہے خواہ وہ کسی مذہب کا زاہد ہو۔ زہد کے لئے خشک ہونا ضروری ہے خواہ وہ کسی مذہب کا زہد ہو۔ زہد کے معنی ہی بے رغبت ہونا ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ وہ کہتا ہے۔ يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ خُذُواْ زِينَتَكُمۡ عِندَ كُلِّ مَسۡجِدٖ (7:31)۔ اے نوع انسان! یہ تصور غلط ہے کہ اطاعتِ خداوندی کے لئے ترکِ دنیا، ترکِ لذات، ترکِ زیبائش وآرائش ضروری ہے۔ یاد رکھو! دنیاوی زیب وزینت اطاعتِ خداوندی کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس، اس اطاعت سے خود زیب وزینت کے پہلو ابھرتے ہیں کیونکہ اطاعت خداوندی کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں خوشگواریاں حاصل ہونا ہیں۔ اور اس کے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں بھی۔

اور اس کے بعد قرآن کریم نے وہ اعلانِ عظیم کیا ہے جو اس باب میں قول فیصل کا حکم رکھتا ہے اور جس سے مذہب کی دنیا میں زلزلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اعلان یہ ہے کہ

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ (7:32)۔ اے رسول! تم ان مذہب پرستوں سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو ان زیب و زینت کی چیزوں کو اور اشیائے خور و نوش کو حرام ٹھہراتا ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں کے استعمال کے لئے پیدا کیا ہے؟ یہ سامانِ زیب و زینت، اس دنیا کی زندگی میں (خدا کے طبعی قانون کے مطابق) کافر و مومن ہر ایک کے لئے کھلا ہے۔ جس کا جی چاہے محنت اور ہمت سے اسے حاصل کر لے۔ لیکن اخروی زندگی میں یہ صرف مومنین کے حصے میں آئے گا۔

آپ نے اندازہ فرمایا کہ کس قدر تحدی ہے اس اعلان میں کہ وہ کون ہے جو خدا کی پیدا کردہ اشیائے زیب و زینت کو لوگوں کے لئے حرام قرار دے دے؟ یہ تو خدا کے مقابل کھڑا ہو جانے کے مرادف ہوگا! اس لئے کہ خدا تو ان چیزوں کو لوگوں کے استعمال کے لئے پیدا کرتا ہے اور یہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان کے قریب نہ جانا۔ ان کا استعمال حرام ہے! یہ خدا کے مقابلہ میں خدا بن جانا نہیں تو اور کیا ہے؟

جنت کی نعما

خدا نے، اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ جنت بتایا ہے۔ اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی جنت۔ اس جنت کی جو تفاصیل قرآن کریم میں آئی ہیں ۔۔۔ اس دنیا میں حقیقی معنوں میں اور اخروی زندگی میں تمثیلی انداز میں جن کا بیان ہوا ہے ان پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ حسن و زیبائش کا کوئی گوشہ بھی ایسا ہے جو اس میں نہ آ گیا ہو؟ سب سے پہلے محاکاتی انداز میں اس منظر کو سامنے لائیے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ آبِ رواں کے کنارے، سبزہ نورستہ۔ گھنیرے درختوں کی چھاؤں، بہار کا موسم جس میں نہ زیادہ

سردی نہ گرمی لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيرًا (76:13)۔ دوسری طرف اعلیٰ درجے کے صوفے۔ حریر و اطلس کے پردے۔ نرم و نازک ریشم کے ملبوسات۔ (18:31) چاندی اور سونے کے برتن۔ بلوریں آبخورے۔ سونے کے کنگن۔ موتیوں کے ہار (16-15:76 ;43:71)۔ مختصراً یہ کہ مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ (43:71)۔ اس میں ہر وہ شے ہوگی جس کی آرزو انسان کرے اور جس سے نگاہیں لذت یاب ہوں۔ حتیٰ کہ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ (30:15) سرسبز و شاداب باغات میں نہایت شستہ اور اعلیٰ پایہ کی موسیقی کی محفلیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ (الحبرۃ) میں حسن و جمال، زیبائی و رعنائی اور انبساط و مسرت کے تمام مظاہر آ جاتے ہیں خواہ وہ جنت نگاہ ہوں یا فردوس گوش۔ یہ ہے وہ جنتی معاشرہ جس کا وعدہ اس دنیا میں کیا گیا ہے اور جس کا تمثیلی بیان جنتِ اخروی کے سلسلہ میں قرآن کریم کے متعدد مقامات میں آیا ہے۔ آپ سوچئے کہ زیب و زینت کی جن حسین و جمیل اشیاء کو قرآن نے جماعت مومنین کی حسن کارانہ زندگی کا ماحصل بتایا ہے کیا انہی اشیاء کے استعمال کو خدا حرام قرار دے گا؟

انسان کا مقام

یہ تو رہا خدا کی پیدا کردہ اشیائے کائنات کے حسن و جمال سے بہرہ یاب ہونے کا تذکرہ۔ اب یہ دیکھئے کہ

تخلیق حسن میں خود انسان کا کیا مقام ہے۔ اس ضمن میں پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کریم کے نقطۂ نگاہ سے خدا اور انسان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ ان کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے۔۔۔ نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق، خدا رفیق اعلیٰ ہے فلہٰذا انسان رفیق ادنیٰ لیکن تعلق ان کا بہرحال رفاقت کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں خدا کا متعین کردہ پروگرام انسان کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے۔

انسانی دنیا میں ایک چیز ہے تولید (Procreation)۔ یعنی افزائش نسل۔ اس میں انسان اور حیوان دونوں برابر ہیں۔ لیکن خدا اس سے بلند ہے۔ دوسری چیز ہے تخلیق (Creation) ان

میں حیوانات کا کوئی حصہ نہیں۔لیکن خدا اور انسان اس میں دونوں شامل ہیں۔خدا نے اپنے آپ کو ''احسن الخالقین'' کہا ہے۔۔۔یعنی تخلیق کرنے والوں میں سب سے زیادہ حسین تخلیق کرنے والا۔ جب اس نے اپنے آپ کو خالقین میں شمار کیا ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے علاوہ خالق بھی تسلیم کرتا ہے۔خدا کے بعد یہ خالق' انسان کے سوا اور کون ہوسکتا ہے؟ اس سے واضح ہے کہ جو خصوصیت انسان کو حیوان سے متمیّز کرتی ہے وہ عمل تخلیق ہے اور اس عمل تخلیق میں انسان اور خدا دونوں شامل ہیں۔اس فرق کے ساتھ کہ خدا کا عملِ تخلیق' حسن کا بلند ترین شاہکار ہوتا ہے۔لہٰذا جس انسان میں تخلیق (Creativeness) کی صلاحیت نہیں وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے۔انسانی سطح پر وہ پہنچ ہی نہیں پاتا۔اسی لئے اقبال نے کہا تھا کہ ؎

ہرکہ او را لذتِ تخلیق نیست
نزد ما جز کافر و زندیق نیست

اور جوں جوں انسان' اپنے عمل تخلیق میں حسن پیدا کرتا جائے گا' وہ رفاقت میں خدا سے قریب تر ہوتا جائے گا اور اس قربِ خداوندی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود انسان کی اپنی ذات میں بھی حسن پیدا ہوتا جائے گا۔عمل خیر ہے ہی وہی جس سے حسنِ کائنات نکھرتا جائے اور انسان کی اپنی ذات سنورتی جائے۔حسنِ کائنات میں یہی اضافے ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے (انسان اور خدا کے مکالمہ میں) خدا کو مخاطب کرتے ہوئے' انسان کی زبان سے کہلوایا ہے کہ ؎

تو شب آفریدی' چراغ آفریدم
سفال آفریدی ! ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ ازسنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

موسیقی

خدا کے پیدا کردہ خام مسالہ کے تخلیقی امتزاج سے انسان کیا کچھ پیدا کرتا ہے' دنیا کی تاریخِ تمدن وتہذیب' اور داستانِ آرٹ اور سائنس اس کی زندہ شہادت ہے۔ جہاں تک آرٹ' اور آرٹ میں موسیقی کا تعلق ہے' حضرت داؤدؑ کو اس میں بڑا نمایاں مقام حاصل ہے۔ انہوں نے عبرانی موسیقی مدون کی تھی اور مصری اور بابلی مزامیر (سازوں) کو ترقی دے کر نئے نئے آلات ایجاد کئے تھے جن میں قانون اور بربط خاص طور پر مشہور ہیں۔ زبور ان کا صحیفہ ہے۔ اس میں' ہر باب کے پہلے یہ ہدایات موجود ہیں' کہ سردار مغنی ان آیات کو کس ساز کے ساتھ گائے۔ اس سے آخری باب میں ہے۔

> قرنائی پھونکتے ہوئے خدا کی ستائش کرو۔ بین اور بربط چھیڑتے ہوئے اس کی ستائش کرو۔ طبلہ بجاتے اور ناچتے ہوئے اس کی ستائش کرو۔ بلند آواز سے جھانجھ بجا کر اس کی ستائش کرو۔ خوش آواز جھانجھ بجا کر اس کی ستائش کرو۔

(تورات۔ صفحہ 616 شائع کردہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور 66ء)

اس میں شبہ نہیں کہ تورات میں بہت کچھ تحریف ہو چکی ہے لیکن ہم موسیقی کے متعلق اس بیان کو اس لئے قابل قبول کہتے ہیں کہ جب قرآن کریم میں جنتی معاشرے میں موسیقی کی محفلوں کا ذکر ہے تو یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اس فن کی تہذیب وتزئین کی ہوگی۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ خود ہمارے ہاں کی کتبِ احادیث کی شروح میں مذکور ہے کہ حضرت داؤدؑ باجے کے ساتھ گایا کرتے تھے (مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری)

کتب احادیث میں ہے کہ مسجد نبویؐ میں حبشیوں کا ناچ ہو رہا تھا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم' ام المومنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق جو تصور عام طور پیش کیا جاتا ہے وہ اس قسم کا ہے کہ آپ بڑے درشت مزاج' قسم کے انسان تھے' جن کے ہاتھوں میں ہر وقت درہ' منہ میں جھاگ' آنکھوں میں شعلے اور ماتھے پر شکن رہتے تھے۔ یہ ان کے

مزاج کی غلط تصویر ہے۔ وہ نہایت لطیف حسیات کے حامل اور بلند ترین ذوقِ جمالیات کے پیکر تھے۔ آپ کے ذوقِ شعری کے متعلق ذرا آگے چل کر ذکر آئے گا۔ جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے آپ اس کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ عربوں کی موسیقی زیادہ تر حدی خوانی اور رجز نوائی تک محدود تھی۔ اس سے آپ کیف اندوز بھی ہوتے تھے اور کبھی کبھی خود بھی ترنم سے شعر پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حضرت عمرؓ کے مکان پر آیا تو میں نے سنا کہ اندر حضرت عمرؓ حدی خوانوں کی طرح گا رہے ہیں۔ میں اندر گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ جو کچھ میں پڑھ رہا تھا، تو نے اسے سنا تھا۔ جب میں نے کہا ہاں تو فرمایا کہ جب ہم تنہا ہوتے ہیں تو جیسے عام لوگ گاتے ہیں، ہم بھی گاتے ہیں۔

خلوت ہی میں نہیں بلکہ جلوت میں بھی۔ ایک دفعہ آپ کسی قافلے کے ساتھ جا رہے تھے تو ایک شعر اس ترنم کے ساتھ پڑھا کہ لوگ سننے کے لئے گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے یہ دیکھا تو جھٹ سے قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ اس پر لوگ منتشر ہو گئے۔ پھر ویسے ہی گایا تو لوگ جمع ہو گئے اور جب آپ نے پھر قرآن پڑھنا شروع کر دیا تو وہ منتشر ہو گئے۔ ہنس کر فرمایا کہ ''ان شیطانوں کی ذریت کو دیکھو۔ گانا گاتا ہوں تو لپک کر آ جاتے ہیں اور قرآن پڑھتا ہوں تو بھاگ جاتے ہیں۔''

ایک قافلہ کے ساتھ، جس میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت ابن عباسؓ بھی تھے، چرواہوں کی ایک ٹولی آ ملی۔ شام ہوئی تو چرواہوں نے رباح فہری سے، جو مشہور گانے والا تھا، حدی خوانی کی فرمائش کی۔ رباح نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ قافلے کے ساتھ حضرت عمرؓ بھی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تم شروع کرو۔ اگر حضرت عمرؓ نے روک دیا تو بند کر دینا۔ اس نے شروع کیا تو حضرت عمرؓ نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ بلکہ سن کر خوش ہوئے۔ جب صبح ہوئی تو رباح سے کہا کہ اب بس کرو۔ ذکرِ الٰہی کا وقت آ گیا ہے۔ دوسری شب چرواہوں نے رباح سے ایک اور گانے کی فرمائش کی جو حدی خوانوں ہی کے اندر کا تھا۔ اس سے بھی حضرت عمرؓ اسی طرح کیف اندوز ہوتے رہے۔ تیسری شب انہوں نے کچھ بازاری قسم کے گانے کی فرمائش کی تو اسے سن کر آپ نے رباح سے کہا

کہ یہ نہیں بھائی! اس سے دلوں میں انقباض اور کدورت پیدا ہوتی ہے۔

ان واقعات سے موسیقی کے جواز و عدم جواز' اور سرودِ حلال وحرام کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے کھینچے ہوئے یہی خطوطِ امتیاز تھے جن کی روشنی میں اقبالؒ نے کہا تھا کہ ''سرودِ حلال'' وہ ہے کہ

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود

اس کے برعکس

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں ناء و چنگ و رباب

مصوری

حضرت سلیمانؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے مختلف علاقوں کے نادرہ کار صناع اپنے ہاں اکٹھے کر رکھے تھے۔ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ (34:13) جو حضرت سلیمان کی منشاء کے مطابق' ان کے لئے بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے تھے اور ان میں مجسمے تراشتے یا تصاویر بناتے تھے۔ تماثیل کا لفظ مجسمے اور تصاویر دونوں کے لئے آ سکتا ہے۔ جہاں تک تصاویر کا تعلق ہے ان کے جائز اور حلال ہونے میں اب کسی قسم کا شبہ ہی نہیں رہا۔ میں نے ''اب'' کا اضافہ اس لئے کیا ہے کہ بڑے بڑے مدعیان شریعت جو آج سے کچھ عرصہ پہلے تک' تصویر اتروانا تو کجا' تصویر دیکھنا بھی حرام قرار دیتے تھے' اب پوز دے کر' بڑے طمطراق سے اپنی تصویریں کھنچواتے اور ان کی نمائش کراتے ہیں۔ جہاں تک مجسمہ سازی کا تعلق ہے' حال ہی میں حکومتِ سعودی عرب کی طرف سے' مودودی صاحب کو جو ایوارڈ ملا ہے' اس کے تمغہ (Medal) میں' شاہ فیصل (مرحوم) کی تصویر ڈھلی ہوئی ہے۔ یہ تو تصویر سے آگے بڑھ کر مجسمہ کے ذیل میں آ جاتا ہے۔ اس باب میں بھی

حضرت عمرؓ کا مسلک بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب مدائن کی فتح کے بعد اسلامی لشکر' کسریٰ کے قصر ابیض میں داخل ہوا تو اس میں یہاں وہاں' مجسموں کے حسین وجمیل شاہکار نصب تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے انہیں نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا اور حضرت عمرؓ نے ان کے اس فیصلے کی تصویب فرمائی اور اس طرح ان مجسموں کو ضائع ہونے سے بچالیا۔

آرٹ۔ (یعنی فنون لطیفہ) میں چار اصناف ہی بنیادی شمار کی جاتی ہیں۔ مجسمہ سازی' تصویر کشی موسیقی اور شاعری۔ پہلی تین کا ذکر آ گیا ہے شاعری کا ذکر آگے آئے گا یہاں قرآن کریم کے ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔

اسماء الحسنٰی

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' حسن نام ہے صحیح صحیح توازن اور تناسب کا۔ جہاں کسی شے کا توازن بگڑا' حسن معدوم ہو گیا۔ اس کے برعکس' اگر مختلف اور باہمدگر متضاد عناصر کے امتزاج میں توازن ملحوظ رکھا جائے' تو ان میں بھی حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ جن حقائق کو صفاتِ خداوندی کہہ کر پکارا جاتا ہے' ان میں باہمی تضاد ہے۔ وہ رحیم بھی ہے اور قہار بھی۔ وہ رؤف بھی ہے اور جبار بھی۔ لیکن یہ صفات' خدا کی ذات میں ایسے صحیح توازن اور اعتدال کے ساتھ جمع ہیں کہ قرآن ان کے مجموعہ کو اسماء الحسنٰی سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ صفات' جو بہ ہیت مجموعی' حسین تریں انداز لئے ہوئے ہیں۔

انسان کے اندر بھی متضاد قوتیں اور جذبات موجود ہیں۔ جس انسان کے اندر' ان قویٰ اور جذبات میں صحیح صحیح توازن پیدا ہو جاتا ہے' اسے متوازن شخصیت (Balanced Personality) کا حامل کہا جاتا ہے۔ ان قوتوں اور جذبات کا اعتدال و توازن کے ساتھ استعمال' حسنِ عمل کہلاتا ہے۔ آرٹ میں یہ اعتدال اور توازن نازک ترین حد تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ کسی حسین ترین تصویر میں آنکھ کی سیاہی میں ایک نقطہ بھر کی کمی یا زیادتی اسے بدترین شکل میں

تبدیل کر دیتی ہے۔ بلند ترین موسیقی میں، کسی سر میں ذرا سا زیادہ ابھار یا اتار راگ کا روپ بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

اعتدال

قرآن کہتا ہے کہ جب خود ان چیزوں میں حسن نام ہے صحیح توازن واعتدال کا تو ان سے لذت یاب ہونے میں بھی اعتدال وتوازن کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ حد اعتدال سے ذرا بھی آگے بڑھے، تو یہی حسن، شر میں تبدیل ہو جائے گا۔ دیکھئے جہاں اس نے کہا تھا کہ وہ کون ہے جو خدا کی پیدا کردہ اشیائے زیبائش وآرائش اور حسین وجمیل سامانِ زیست کو حرام قرار دے، تو وہیں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ان سے بہرہ یاب ہو لیکن **وَلَا تُسْرِفُوْا** حد سے آگے نہ بڑھ (7:31) **اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ** حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ یعنی ان اشیاء سے لذت یاب ہونا خدا کے نزدیک ناپسندیدہ نہیں۔ اس کے نزدیک حد سے بڑھنا ناپسندیدہ ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جسے اس نے سورۃ کہف کی اس آیت میں، جسے میں شروع میں پیش کر چکا ہوں۔ کہا ہے کہ **اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا** ہم نے سطح ارض پر بڑی زیب وزینت کی چیزیں پیدا کی ہیں۔ **لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا** (18:7) تا کہ یہ دیکھا جائے کہ ان میں سے کون اپنے اعمالِ حیات میں توازن واعتدال قائم رکھتا ہے۔ یہ تو پھر بھی زیب وزینت سے متعلق ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ **وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا** صفاتِ خداوندی اپنے اندر انتہائی حسن واعتدال لئے ہوئے ہیں۔ انہیں اسی حسن واعتدال کے ساتھ اپنے اندر اجاگر کرو **وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ** (7:180) جو لوگ ان میں اعتدال قائم نہیں رکھتے بلکہ اس کی کسی ایک صفت کو لے کر افراط کی طرف نکل جاتے ہیں، ان سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ جس طرح مثلاً عیسائیوں نے خدا کی صفت ''رحیمی'' میں اس قدر غلو کیا کہ قانونِ مکافاتِ عمل کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس سے نہ صرف ان کی اپنی ذات کا حسن بگڑ گیا بلکہ انسان کی تمدنی دنیا میں بھی فساد ہی فساد پیدا ہو گیا۔

یہ ہے وہ بنیادی شرط جس کے ساتھ قرآن کریم جمالیات سے متمتع ہونے کی تاکید کرتا ہے۔ یعنی زندگی کے افادی اور جذباتی گوشوں میں صحیح صحیح تناسب قائم رکھتے ہوئے' افادی اور جذباتی گوشوں کی مثال پٹرول اور موبل آئل کو سمجھئے۔ اگر کار میں پٹرول ہی پٹرول ہو۔ موبل آئل نہ ہو' تو اس کا انجن خود اپنی حرارت سے پھک جائے گا اور اگر اس کی پٹرول کی ٹنکی میں بھی موبل آئل ڈال دیا جائے......نہیں' اگر موبل آئل ذرا اپنے مقام سے آگے بڑھ کر پٹرول میں دخل انداز ہو جائے۔ تو موٹر کے پرزے چیکٹ ہو کر رہ جائیں گے۔ یاد رکھئے جمال اور جلال کے صحیح امتزاج ہی سے' زلفِ کائنات کی مشاطگی ہو سکتی ہے' اقبالؒ کے الفاظ میں۔

نہ جدا رہے نواگر' تب و تابِ زندگی سے
کہ ہلاکئ امم ہے یہ طریقِ نے نوازی

بلکہ اور واضح الفاظ میں۔

اے اہلِ نظر' ذوقِ نظر خوب ہے' لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ ہنر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

وہ پیمانہ کیا ہے

سوال یہ ہے کہ وہ پیمانہ کیا ہے جس سے یہ ماپا جا سکے کہ ہم نے افادی اور جمالیاتی گوشوں میں صحیح توازن قائم رکھا ہے' ان کے اعتدال کو بگڑنے نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ اسے افراد کے اپنے اپنے فیصلے پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جس طرح' مختلف علوم کے ہر شعبے اور فن کے ہر گوشے کے لئے کچھ بنیادی اصول اور معیار ہیں' اسی طرح' افادیت اور جمالیات میں توازن قائم رکھنے کے لئے بھی بنیادی

اصول اور معیار ہیں۔ جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یعنی خدا کے مقرر کئے ہوئے پیمانے جن میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے' ان پیمانوں کے مطابق ان سے بہرہ یاب ہوا جائے تو یہ عین مطابق اسلام ہوگا۔ ان حدوں کو پھاند جایئے اور ان پیمانوں کو توڑ دیجئے تو یہ حرام ہو جائے گا۔ یہی حدود فراموش اور پیمانہ شکن ہیں وہ فنکار جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

وہ نغمہ سردیء خونِ غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

یہ حدیں اور پیمانے قرآن کے اندر محفوظ ہیں جو اُس خدا کی کتاب ہے جو کائنات کے افادی اور جمالیاتی گوشوں کا خالق اور انسانی ممکنات کی نشو و نما کے تقاضوں سے باخبر ہے۔

اب آیئے شاعری کی طرف۔ قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے۔ وَمَا عَلَّمۡنٰهُ الشِّعۡرَ وَمَا يَنۡۢبَغِىۡ لَهٗ (36:69) ہم نے اسے شاعری نہیں سکھائی۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری ایک پیغامبر کے شایانِ شان ہوتی ہی نہیں۔ اس سے' بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ قرآن کریم شاعری کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن یہ نکتہ ذرا تشریح طلب ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم نے جب شاعری کی مذمت کی ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ اس کے نزدیک نثر میں بیان کردہ مفہوم قابل قبول ہوتا ہے اور اسی مفہوم کو اگر نظم میں بیان کر دیا جائے تو وہ مذموم اور مردود قرار پا جاتا ہے۔ ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ قرآن' اسلوبِ بیان سے بحث نہیں کرتا۔ مقصودِ بیان کے حقائق سے بحث کرتا ہے۔ چنانچہ جس آیت کو میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے رسول کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی شاعری' ایک رسول کے شایان شان ہوتی ہے تو اس سے آگے ہے۔ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ وَّقُرۡاٰنٌ مُّبِيۡنٌ (36:69)۔ جو کچھ ہم نے

رسول کو دیا ہے وہ تاریخی شواہد اور زندگی کے بنیادی اصول اور واضح قوانین ہیں اور ان سے مقصد یہ ہے۔ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70)۔ جن لوگوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت اور آرزو ہے یہ انہیں اس کے ذریعے زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر سکے۔ قرآن کریم تاریخی شواہد اور زندگی کے ٹھوس حقائق سے بحث کرتا ہے اور شاعری اس کے خلاف جذبات سے کھیلتی اور لطائف سے اس کا جی بہلاتی ہے۔ رسول کے سامنے زندگی کا ایک متعین نصب العین ہوتا ہے اور اس کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھتا ہے۔ نہ مشکلات و مصائب اس کے لئے سنگِ راہ بنتی ہیں اور نہ ہی مفاد پرستانہ جاذبیتیں اس کی دامن گیر ہو کر حصولِ مقصد کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ گوئٹے کے الفاظ میں اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔

در راہ او بہار پری خانہ آفرید
نرگس دمیدو لالہ دمید و سمن دمید
گل عشوہ داد وگفت یکے پیش ما بایست
خندید غنچہ و سر دامان او کشید
نا آشنائے جلوہ فروشان سبز پوش
صحرا برید و سینہ کوہ و کمر درید
زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ ازہمہ بیگانہ می رود

رسول کی یہ کیفیت زندگی کی جمالیاتی وادیوں میں ہوتی ہے۔ جہاں تک جلال کا تعلق ہے اس کا عالم یہ ہوتا ہے کہ

دریائے پر خروش زبند و شکن گذشت
ازتنگنائے وادی کوہ و دمن گذشت
یکساں چوں سیل کردہ نشیب و فراز را
از کاخ شاہ وبارہ وکشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بے قرار
در ہرزماں بتازہ رسید از کہن گذشت
زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

یہ کیفیت ہے مصافِ زندگی میں ایک رسول کی جو عالمگیر انقلاب کا داعی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس شاعروں کے متعلق قرآن کریم نے کہا کہ **اَلَمْ تَرَ اَنَّھُمْ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ** (26:225)۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ کس طرح اھیم کی طرح، مختلف وادیوں اور بیابانوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ الاھیم اس اونٹ کو کہتے ہیں جسے جھوٹی پیاس کی بیماری لگ جائے اور وہ اسے مختلف چراگاہوں اور نخلستانوں میں لئے لئے پھرے لیکن کسی جگہ اس کی تشنگی دور نہ ہو۔ شاعر کے سامنے چونکہ زندگی کا متعین نصب العین نہیں ہوتا، اس لئے وہ کبھی جذبات کی ان وادیوں میں مارے مارے پھرتا ہے اور کبھی تخیلات کی ان جولانگاہوں میں۔ اور چونکہ یہ جذبات بھی جھوٹے ہوتے ہیں اس لئے اس کی کہیں تسکین ہی نہیں ہوتی۔ وہ ساری عمر یونہی بھٹکتا پھرتا ہے۔ **یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوٗنَ** اور اس کے پیچھے لگنے والے بھی بھٹکتے پھرتے ہیں، لیکن شاعر کو اس سے دھوکا لگ جاتا ہے کہ اس کے متبعین کی جماعت بہت بڑی ہے۔ حالانکہ یہ جماعت نہیں، ایک انبوہ کثیر ہوتا ہے جس کی حالت ٹڈی دل کی سی ہوتی ہے۔ (الغاوی) ٹڈی دل کو کہتے ہیں۔ دیکھنے میں لاکھوں لیکن بغیر کسی نصب العین کے۔ ان سب کا آخری نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ پھر، ان شاعروں کی اپنی زندگی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ **اَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ** وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جنہیں خود کر کے نہیں دکھاتے۔ اس

لئے کہ جب پیاس ہی جھوٹی ہو تو قول اور عمل میں موافقت کیسے ہو؟

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک' شاعری' پیرایۂ بیان کا نام نہیں۔ یہ ایک خاص ذہنیت کا نام ہے جو اس ذہنیت کی نقیض ہوتی ہے جسے قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اس نے شاعروں کی اس ذہنیت کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے **اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** ان کے برعکس وحی کی صداقتوں پر ایمان رکھنے والوں کی ذہنیت ہے جو ایک متعین نصب العین پر یقین رکھتے ہیں اور ایسے پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں جو ان کی اپنی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشو ونما کرے' اور دنیا کے بگڑے ہوئے کام بھی سنوارے **وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا** جب ان پر کوئی ظلم اور زیادتی کرے' تو وہ سودا کی طرح ''غنچے'' کو آواز نہیں دیتے کہ!؟ ذرا لانا تو میرا قلمدان ہجو لکھ کر اسے مزہ چکھادوں۔'' وہ اس سے اس زیادتی کا بدلہ لیتے ہیں **وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ** (26:227) جس میں ظلم اور زیادتی کرنے والے بدلگام نہ پھرتے رہیں کہ جو ان کے جی میں آئے کریں۔ انہیں کوئی روکنے والا ہی نہ ہو۔ اس نظام میں اس قسم کے لوگوں کو صاف نظر آجاتا ہے کہ انہیں ان کی غلط روش سے ہٹا کر کس مقام کی طرف لایا جائے گا اور ان کا ٹھکانہ کون سا ہوگا۔

یہ ہے فرق شاعرانہ ذہنیت اور مومنانہ ذہنیت میں۔ قرآن کریم نے اس (شاعرانہ) ذہنیت کی مذمت کی ہے' نہ کہ شعر کی مذمت۔ کالرج نے جب کہا تھا کہ شاعری کی ضد (Anti-Thesis) نثر نہیں بلکہ سائنس ہے' تو اس سے اس نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔

شاعری اور نبوت

اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ دیگر اقوام عالم (مثلاً یونان وغیرہ) کی طرح' عربوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ تھا کہ (کاہنوں اور نجومیوں کی طرح) شاعر کو بھی الہام ہوتا ہے۔ اس لئے وہ نبوت کو بھی از قبیلِ شاعری سمجھتے تھے۔ وہ رسول اللہ کو کبھی ساحر' کبھی کاہن اور کبھی شاعر کہتے تھے۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کی بھی تردید کی اور کہا کہ نبوت' شاعری نہیں۔ شاعروں کا ہاتف اور سروش' ان کے اپنے تخیلات کی تخلیق ہے۔ اس کے برعکس' وحی نبوت ایک خارجی حقیقت

ہے جو نبی کے اپنے جذبات، تخیلات یا وجدان کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ قرآن کریم جب شاعروں کی مذمت کرتا ہے تو اس سے اس کا مقصد اس عقیدہ کی تردید بھی ہوتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ (مصوری اور موسیقی کی طرح) قرآن کریم شعر کی مذمت نہیں کرتا۔ وہ دیکھتا یہ ہے کہ شاعر کہتا کیا ہے؟ اس باب میں اس کا معیار یہ ہے کہ

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات
نہ ہو روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

اور سینے کو روشنی، خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کی قندیل ہی سے مل سکتی ہے جب سینہ اس شمعِ نورانی سے روشن ہو، تو پھر شاعر کے سامنے زندگی کی تمام شاہراہیں جگمگاتی چلی جاتی ہیں اور وہ جنت سے نکلے ہوئے آدم کو پھر سے جنت کی طرف لے جانے والا راستہ دکھاتا ہے، یہ وہ مقام ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

اس انداز کی شاعری کی نشیدِ حیات افزا محفلِ نبویؐ میں بھی وجہِ فردوسِ گوش ہوتی تھی۔ حضرت حسانؓ بن ثابت خود نبی اکرمؐ کے حضور شعر پڑھا کرتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات حضورؐ ان سے شعر خوانی کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ شعر و شاعری کے متعلق یہی انداز حضرت عمرؓ کا تھا۔ وہ شعر کو دل سے پسند کرتے تھے، لیکن اسی شعر کو جو حقائق کا آئینہ دار ہو اور زندگی اور حیات کا پیغامبر۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

وہ خود اپنے بیٹے (عبدالرحمٰن) سے کہا کرتے تھے کہ ”بیٹا! اچھے اچھے شعر یاد کیا کرو تاکہ تمہارے ادب میں اضافہ ہو۔ جسے اچھے شعر یاد نہ ہوں وہ کبھی ادیب نہیں بن سکتا۔“

عربوں کی شاعری کے متعلق فرمایا۔

اہلِ عرب کا بہترین فن اشعار ہیں کہ انسان اپنی ضروریات میں ان سے کام لیتا ہے۔ یہ سخی کو مائل بہ کرم کر دیتا ہے حتیٰ کہ بخیل کا دل بھی نرم کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ فرمایا۔

شعر ایک ایسی قوم کا فن تھا جس کے پاس اس سے بہتر کوئی فن نہیں تھا۔ جب اسلام آیا تو اہلِ عرب جہاد میں مصروف ہو گئے اور شعر اور اس کی روایات سے غافل ہو گئے۔ بعد ازاں جب اسلام پھیل گیا۔ فتوحات کی کثرت ہو گئی اور اہلِ عرب شہروں میں اطمینان سے بیٹھ گئے تو پھر روایتِ شعر کی طرف رجوع کرنے لگے۔ ان کے پاس نہ کوئی مدون دیوان تھا نہ کوئی لکھی ہوئی کتاب۔ بہت سے عرب طبعی موت مر چکے یا تلوار کی نذر ہو چکے تھے۔ لہٰذا جو کچھ اس نے پایا اسے یاد کر لیا' اگرچہ بہت سا شعری سرمایہ ضائع ہو گیا اور بہت کم محفوظ رہا۔

یہ تو بالتحقیق نہیں کہا جا سکتا' آپ خود بھی شعر کہتے تھے یا نہیں لیکن تاریخی واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ کو اس قدر شعر یاد تھے کہ جو اہم بات بھی آپ کے سامنے آتی اس کے متعلق آپ حسبِ حال شعر سنا دیا کرتے۔ اور شعر کا ذوق اتنا بلند اور مذاق ایسا سلیم تھا کہ بڑے بڑے شعراء کا کلام آپ کے سامنے محاکمہ کے لئے پیش کیا جاتا اور آپ اس سلسلہ میں ایسے لطیف نکات بیان فرماتے کہ اہلِ مجلس عش عش کر اٹھتے۔ کتب محاضرات و ادب' آپ سے متعلق اس قسم کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔ (شاہکار رسالت)

یہ وہ شاعری ہے جو دلوں کی دنیا میں انقلاب پیدا کر کے' ہر دور کے فرعونوں' ہامانوں اور قارونوں کا تختہ الٹ کر رکھ دیتی ہے۔

صَد نالۂ شب گیرے　　صد صبحِ بلا خیزے
صد آہِ شرر ریزے　　یک شعر دل آویزے

قرآن کا پیغام' حیات کا پیغام ہے۔ انقلاب کا پیغام ہے۔ غلط نظامِ زندگی کی ہر بساط کو الٹ کر اس کی جگہ صحیح نظامِ زندگی متشکل کرنے کا پیغام ہے۔ یہ انسانی ذات کے نکھرنے اور حسنِ کائنات کے نکھارنے کا پیغام ہے۔ یہ خود سنور کر دنیا کے ہر بگاڑ کو سنوارنے کا پیغام ہے۔ یہ حیوانی سطحِ زندگی پر جینے والوں کو مقامِ آدمیت سے متعارف کرانے' اور آدم کو انسانیت کی سطح پر لے جانے کا پیغام ہے۔ یہ پیغام ہے انسان کو اس بلند مقام سے متعارف کرانے کا جہاں' وہ (نٹشے کے الفاظ میں) "اپنے مقدر کے ستاروں کو جھک کر دیکھے۔" نغمہ ہو یا شعر۔ رنگ ہو یا چنگ' اگر وہ اس پیغام حیات آور کا نقیب ہے' تو وہ حلال ہی نہیں' فریضہ حیات ہے۔ اور اگر وہ جیتے جاگتے انسانوں کو موت کا پیغام دیتا ہے' تو اس کے حرام ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ یہ وہ آرٹ ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

تو ہے میت' یہ ہنر تیرے جنازے کا امام
نظر آئی جسے مرقد میں شبستانِ حیات

آرٹ وہی حیات بخش ہو سکتا ہے جس میں جلال اور جمال کا صحیح امتزاج ہو۔ اگر یہ نہیں تو اس کی حیثیت برگِ حشیش سے زیادہ کچھ نہیں۔

دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

یہ ہے' عزیزانِ من! میری بصیرت کے مطابق قرآن کریم کی رو سے آرٹ کی حیثیت۔

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت۔ عرب کا سوزِ دروں

اگر بایں نرسیدی' تمام بولھبی است۔۔۔ لہو گرما دینے والی موسیقی کے اثرات کا اندازہ تو ہم بھارت کے ساتھ اپنی 1965ء کی جنگ میں کر چکے ہیں۔ 6 ستمبر کی صبح' لاہور پر ہندوؤں کے اچانک حملہ

سے فضا میں جو اضطرابی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، شام کو جب ریڈیو سے ۔۔۔ساتھیو! مجاہدو! جاگ اٹھا ہے سارا وطن ۔۔۔ کی فلک شگاف آواز پورے دبدبہ اور طنطنہ کے ساتھ سکوت شکن ہوئی ہے تو اس نے ہوا کا رخ بدل دیا۔ اس سے دلوں میں نئے ولولے بیدار ہو گئے اور ہمتیں بلند تر ہوتی چلی گئیں۔ اس کے بعد، مسلسل سترہ دن تک، ملی ترانوں نے فضا میں جو ارتعاش پیدا کر رکھا تھا اس کے اثرات کی داستانیں ان سپاہیوں سے سنئے جن کے لئے یہ آوازیں، زندگی اور حرارت کا ہزار سامان اپنے جلو میں لئے، فردوسِ گوش بنتی تھیں اور ابھی یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا ۔۔۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر پیغامِ حیات افروز کے ساتھ، مغنیِ آتش نفس کی نشیدِ جلال انگیز بھی شامل ہو جائے تو یہ کس قدر وجہِ فروغِ جذبات ہو سکتے ہیں۔ اور جب ان جذبات سے، وحی کی روشنی میں کام لیا جائے تو شہپرِ انسانیت کی طرح ''بال و پرِ روح الامین'' پیدا کر لیتا ۔۔۔ میں اسے پھر دہرا دوں کہ فطرت کی طرف سے انسان کو جس قدر صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں وہ بجائے خویش نہ خیر ہیں نہ شر۔ ان کا استعمال خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ اگر ان صلاحیتوں کو خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھا جائے تو اس کا نتیجہ خیر ہی خیر ہوتا ہے خواہ وہ شعر و سخن کے حسین پیکر میں ہوں یا رنگ و چنگ کے حریری لباس میں ۔۔۔ انسانی صلاحیتیں!

لا دیں ہوں تو ہیں زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہوں دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

آرٹ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، کیا یہ ہماری خوش نصیبی نہ ہو گی کہ اس کے متعلق شاہکار خداوندی، جلال و جمال کے اس حسین ترین پیکرِ اقدس و اعظمؐ کے ارشادات گرامی ہمارے لئے وجہِ فروغِ دیدہ ہوں جسے خالقِ کائنات نے، عالمگیر انسانیت کے لئے اسوہ حسنہ (حسین ترین ماڈل) قرار دیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ 1917ء میں، علامہ اقبالؒ نے ایک مختصر سا مقالہ سپردِ قلم فرمایا جس کا عنوان تھا۔

جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ

اس مضمون میں اس مقالہ کا اضافہ' تسبیح کے دانوں میں امام کی حیثیت رکھتا ہے' ملاحظہ فرمایئے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کی عربی شاعری کی نسبت وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا ان کی روشنی صفحاتِ تاریخ کے لئے خطِ شعاع کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن دو موقعوں پر جو تنقیدات آپؐ نے فرمائیں ان سے مسلمانانِ ہند کو آج کل کے زمانہ میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا ادب ان کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ ہے اور آج کل انہیں ایک نئے ادبی نصب العین کی تلاش ہے۔ شاعری کیسی ہونی چاہئے اور کیسی نہ ہونی چاہئے یہ وہ عقیدہ ہے جسے جناب رسالت مآب صلعم کے وجدان نے اس طرح حل کیا ہے۔ امراء القیس نے اسلام سے چالیس سال پہلے کا زمانہ پایا ہے۔ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جناب پیغمبر صلعم نے اس کی نسبت ایک موقع پر حسب ذیل رائے ظاہر فرمائی ''اشعر الشعراء وقائد ھم الی النار'' یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے لیکن جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امراء القیس کی شاعری میں وہ کون سی باتیں ہیں جنہوں نے حضور سرور کائنات صلعم سے یہ رائے ظاہر کروائی۔ امراء القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شراب ارغوانی کے دور' عشق و حسن کی ہوش ربا داستانوں اور جان گداز جذبوں' آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں' سنسان ریتلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہی عرب کے دور جاہلیت کی کل تخلیقی کائنات ہے۔ امراء القیس قوتِ ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنونِ لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی

زندگی کے محاسن، ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھا دے۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کی شکایات وامتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے فرسودگی وانحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھا دے اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اسے دکھایا گیا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرے۔ نہ یہ کہ اٹھائی گیرہ بن کر جو رہی سہی پونجی ان کے پاس ہے اس کو بھی ہتھیا لے۔

ایک دفعہ عرب زبان کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا۔

ولقد ابیت علی الطّوی واظلہ
حتی انال بہ کریم الماکل

(ترجمہ) میں نے بہت سی راتیں محنت ومشقت میں بسر کی ہیں، تاکہ میں اکل حلال کے قابل ہوسکوں۔ رسولؐ اللہ جن کی بعثت کا مقصد وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آئند اور مطبوع کر کے دکھائیں اس شعر کو سن کر بے انتہا محفوظ ہوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہے کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔"

اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزند اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے چہرہ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا نظارگیوں کے لئے دنیوی برکت اور اخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا خود ایک بت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس عرب نے اپنے شعر میں ایسی کون سی بات کہی تھی؟

رسولؐ اللہ نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی

جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں ان کا نقش پردہ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضور خواجۂ دوجہان صلعم نے جو اس قدر شعر کی تعریف فرمائی اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی۔

ہر وہ استعداد جو مبداء فیض نے فطرتِ انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے ایک مقصد وحید اور ایک غایت الغایات کے لئے وقف ہے یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز، جوش سے سرشار ہو، ہر انسانی صنعت اسی غایتِ آخرین کی تابع اور مطیع ہونی چاہئے اور ہر شے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہئے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے۔ تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو جیتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں (کہ انہیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، انحطاط اور موت کا پیغام ہے۔ صنعت گر کو چنیا بیگم کے حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہئے۔ مصور فطرت کو اپنی رنگ آرائیوں کا اعجاز دکھانے کے لئے افیون کی چٹکی سے احتراز واجب ہے یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ ''کمال صنعت اپنی غایت آپ ہے۔'' انفرادی، اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے۔ غرض یہ کہ رسول اللہؐ کے وجدانِ حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا اس نے اس اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح ارتقاء کیا ہونی چاہئے۔ (''ستارہ صبح''۔ لاہور۔ 1917ء)

☆......☆......☆